

آہ! بیچارہ ”دوقومی نظریہ“

(کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو)

پرویز

زندہ قومیں، ان اساسات کی جو ان کی مملکت یا قومیت کی بنیاد ہوتی ہیں بڑی شدت اور حمیت سے حفاظت کرتی ہیں۔ اور کسی ایسی حرکت یا جنبش کو نہ روا رکھ سکتی ہیں نہ برداشت کر سکتیں جو اس میں ذرا سا بھی تزلزل پیدا کرنے کا موجب ہو۔ اس کے برعکس جن قوموں کے دل میں اپنی مملکت یا آزادی کی اہمیت نہیں رہتی ان میں ان اساسات کے خلاف دساوس انگیزیاں اور شکوک طرازیوں معمول بن جاتی ہیں جن سے رفتہ رفتہ اُس مملکت کی عمارت ہی ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ بد قسمتی سے مملکت پاکستانیہ شروع ہی سے اس قسم کی دسوسہ انگیزیوں اور فتنہ پردازوں کی آماجگاہ بنے چلی آرہی ہے۔

مطالبہ پاکستان کی اساس و بنیاد اس نظریہ پر تھی کہ اسلام کی رو سے قومیت کی تشکیل اشتراکِ وطن کی بنیادوں پر نہیں ہوتی۔ ایمان کے اشتراک کی بنا پر ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، ہندوستان میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم نہیں۔ یہاں کے مسلمان اپنے دین کی بنا پر غیر مسلموں سے الگ ایک قوم ہیں، اس لئے ایک جداگانہ آزاد مملکت کے دعویدار۔ ہندوستان میں اس نظریہ اور دعوے کی مخالفت ہوئی — ہندوؤں کی طرف سے بھی اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرف سے بھی۔ اور ہم تحریر پاکستان کے مؤیدین نے ان کے ہر اعتراض کا جواب دیا۔ بتوفیقِ ایزدی ہمیں کامیابی ہوئی اور اس طرح مملکت پاکستان وجود میں آگئی۔

اس خطہٴ زمین میں پہلے سے بھی کچھ لوگ بستے تھے اور اس کی تشکیل کے بعد کثیر تعداد میں لوگ دوسرے مقامات سے منتقل ہو کر یہاں آئے۔ اقل الذکر زمرہ کے لوگ ہوں یا ثانی الذکر گروہ کے ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے بھی اس مملکت کو اپنا نشیمن بنایا ان کے متعلق یہ توقع کی جاسکتی تھی (اور بجا طور پر کی جانی چاہیے تھی) کہ وہ اس مملکت کی اساس و بنیاد سے متفق ہیں اور اس کے محافظ اور امین۔ لیکن بعد میں ردِ غما ہونے والے حالات نے اس حسن ظن اور نیک توقع کی تردید کر دی اور دیکھا یہ گیا کہ یہاں وہ لوگ بھی موجود ہیں جو نہ صرف اس کی اساس پر یقین نہیں رکھتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ دساوس انگیزیوں سے اس کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا جائے۔ ایمان کے اشتراک کی بنا پر مسلمانوں کی الگ

قومیت کے نظریہ کے خلاف (جسے مختصر الفاظ میں ”دوقومی نظریہ“ کہا جاتا ہے) یہاں جو لب کٹائی بھی ہوگی وہ ان کی اسی سٹی نامراد کی غماز ہوگی۔

میں تحریک پاکستان کے دوران بھی اس قسم کے اعتراضات کا جواب دیتا رہا اور تشکیل پاکستان کے بعد بھی۔ اس لئے کہ دوقومی نظریہ ”میرا سیاسی مقصد ہی نہیں میرے ایمان کا جوڑ ہے۔ حال ہی میں اس موضوع پر میرا مسموط اور قرآنی اسناد سے بھرپور مقالہ (طلوع اسلام) بابت جنوری ۱۹۸۱ء اور نوائے وقت کی اشاعت بابت ۱۲ نومبر ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا جسے ملک کے ارباب دانش و بنیٹھ نے بتظہر تحسین دیکھا۔ وہ مقالہ ایسا مسموط اور مدلل تھا کہ میں سمجھتا تھا کہ اس کے بعد اس نظریہ کے خلاف کوئی کچھ نہیں لکھے گا۔ لیکن مخالفت کرنے والوں کو کون روک سکتا ہے؟ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ”دوقومی نظریہ اور اسلامی نظریہ کی جامعیت“ کے عنوان سے محترم فتح نصیب چوہدری کے قلم سے ایک طویل مقالہ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۱۲ اور ۱۳ اپریل میں دو قسطوں میں شائع ہوا اور آخر میں ”جاری ہے“ لکھا ہے۔ یہ مقالہ کچھ ایسا پیش رفتہ اور صاحب مقالہ کی قرآن کریم کی تعلیم سے ناواقفیت کا آئینہ دار ہے کہ میں اسے درخور اعتناء سمجھتا۔ لیکن مقالہ نگار کے نام کے ساتھ ”شعبہ سیاسیات پنجاب یونیورسٹی“ کا لاحقہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان صاحب کے خیالات ان کی ذات تک محدود نہیں۔ اُسٹاد ہونے کی جہت سے اس سے ان کے طلبہ کے (ناپختہ) ذہنوں کے متاثر ہو جانے کا بھی خدشہ ہے۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ قرآن کریم کی روشنی میں اصل حقیقت کو ایک بار پھر دہرایا جائے۔ خود مسلمانوں کی طرف سے اسلام کے خلاف اعتراضات کی جوابدہی شاید میری زندگی کا مقدّر بن چکی ہے۔ ٹھیک ہے غ۔

تو مشقی ناز کر خونِ ود عالم میری گردن پر

(۵)

مقالہ نگار آغاز کلام اس طرح کرتے ہیں:-

برصغیر ہند کی تقسیم جس کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا، کے متعلق ہم سب جانتے ہیں کہ قائد اعظم کے مشہور دوقومی نظریہ کی بنیاد پر عمل میں آئی تھی۔ لیکن یہ دوقومی نظریہ کیا تھا۔ اس کی نظریاتی اور عملی بنیادیں کیا تھیں۔ قائد اعظم نے کن اصول و دلائل کے حوالے سے اپنے اس نظریہ کو پیش کیا تھا۔ برصغیر کی بین الاقوامی سیاست کے حوالے سے ان سب سوالات کے جوابات کا ہم میں سے بیشتر کو صحیح طور پر علم نہیں۔ اس سلسلہ میں ہم عام طور پر اور ہمارے لکھنے والے خاص طور پر جو موقف اختیار کرتے ہیں اسے اگر مختصراً بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ اسلام کی رو سے قومیت کا معیار چونکہ نسلی اور وطنی رشتے نہیں بلکہ صرف نظریہ حیات ہے۔ اس لئے مسلمانانِ برصغیر یہاں کے ہندوؤں اور دوسرے باشندوں سے جداگانہ نظریہ حیات کے پیروکار ہونے کے ناطے ایک الگ قوم قرار پاتے ہیں۔ لیکن یہ موقف علمی

اشتراک ہے۔ اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ پھر قومیت کا معیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-
اس کا مطلب یہ ہوا کہ قوم صرف اور محض نظریاتی اشتراک یا مذہبی اتحاد کی بنا پر وجود میں آنے والی انسانی جمعیت کا نام نہیں بلکہ انسانوں کے ایک ایسے اجتماع کا نام ہے جو ثقافتی اتحاد کی تمام معروف قدروں کی بنیاد پر وجود میں آیا ہو۔
آگے چل کر لکھتے ہیں:-

اسلام میں بھی قومیت کا معیار نظریہ حیات نہیں بلکہ نسلی اور ثقافتی یکسانیت ہی ہے۔ اور قرآن کی رو سے قوم ایسے ہی گروہ کو کہا جائے گا جو نظریہ حیات کی بنا پر نہیں بلکہ ثقافتی یکسانیت کی بنا پر وجود میں آیا ہو۔ لہذا یہ کہنا کہ اسلام قومیت کا معیار نسل یا وطن کو نہیں بلکہ صرف اور صرف نظریہ حیات کو قرار دیتا ہے قرآن کی رو سے غلط ٹھہرتا ہے۔
اور قطع کے بند میں بالکل کھل کر سامنے آجاتے ہیں، جب کہتے ہیں:-
نسلی یکسانیت، انسانی وحدت، مذہبی اشتراک اور جغرافیائی وحدت سب کی سب اگرچہ کسی گروہ میں مشترک ثقافتی ورثہ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں مگر ان میں قومیت کے اعتبار سے جغرافیائی وحدت سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہے۔
اور ان کی آخری دلیل یہ ہے کہ

ہمارے علمی حلقوں میں جو یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اسلام کے پیروکار ہونے کے ناتے ہم مسلمان ایک قوم ہیں یا یہ کہ اسلام کا قومیت کا معیار نسل یا ثقافتی رشتے نہیں بلکہ صرف اور صرف نظریہ حیات ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم قوم اور ملت یا امت کی اصطلاحوں کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں حالانکہ یہ دونوں اصطلاحیں لغوی اعتبار سے بہت مختلف ہیں۔ (اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اشتراک مذہب کی بنا پر مسلمان ایک امت قرار پائیں گے۔ ایک قوم نہیں۔ قرآن نے انہیں قوم نہیں، امت ہی کہا ہے۔ اس لئے) "مسلمان کو ایک قوم نہیں، مسلمان کو ایک امت یا امت اسلام کہنا چاہئے گا۔ جہاں تک ان کی قومیت کا تعلق ہے تو وہ اسی نسل یا ثقافتی ورثہ کے حوالے سے متعین ہوگی جس سے ان کا نسلی یا ثقافتی تعلق ہوگا۔

تصريحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ چودھری فتح نصیب صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ

- (۱) اسلام میں تقسیم انسانیت کی بنیاد مذہب نہیں۔
- (۲) قائد اعظم نے بھی مسٹر گاندھی اور دیگر نیشنلسٹ لیڈروں کے اعتراضات کے جواب میں صرف مذہب کو وجہ ایماعت قرار نہیں دیا تھا۔
- (۳) اگر مذہب کو بناؤ قومیت قرار دے دیا جائے تو دنیا کی سینکڑوں قوموں کے متعلق کیا جائیگا۔
- (۴) تشکیل قومیت کی بنیاد ثقافتی، نسلی یا جغرافیائی وحدت ہے۔

(۵) قرآن میں مسلمانوں کے لئے اُمت کا نسطا آیا ہے، قوم کا نہیں۔

آئیے ان دعاوی کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ یہ کس قدر منہ اٹھ آفرینی پر مبنی ہیں۔ واضح رہے کہ یہ اعتراضات تھے نہیں۔ یہ سب، تحریک پاکستان کے دوران محققین کی طرف سے اٹھائے جاتے تھے۔ اور طلوع اسلام میں ان کا تفصیلی جواب ساتھ کے ساتھ دیا جاتا تھا۔ (تفصیل کے لئے میں قارئین کی توجہ اپنے اس مقالہ کی صرف سبڈول کراؤں گا جو ”دو قومی نظریہ“ کے عنوان سے لوائے وقت کی ۱۲ نومبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے) اب یہ دیکھئے کہ اسلام کی رو سے صحیح پوزیشن کیا ہے۔

(۰)

۱، قرآن کریم کی رو سے بناء تقسیم

قرآن کریم میں ہے:-
هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فِي نَفْسِهِ كَأَنزَالِ الْغُثَاثِ وَالنَّخْلِ
خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ كَفَرًا
بِآيَاتِ اللَّهِ وَلِقَائِهِ ذَٰلِكَ يَكْفُرُ بِهِ
الْمُنَافِقُ إِذْ يُوعِظُ بِأَيِّ آيَةٍ تَقْرَأُ
فَيَسْتَعْجِلُ بِهَا وَيَسْتَعْجِلُ يَوْمَئِذٍ فَيَكُونُ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۹۲)

سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے انسانوں میں جو تفریق و تقسیم کی ہے اس کی بنیاد خالص مذہب (کفر و ایمان) ہے یا اس کے ساتھ، یا اس سے الگ، کوئی اور عنصر بھی؟ قرآن نے وجہ تقسیم صرف اور صرف کفر و ایمان کو قرار دیا ہے۔

کفر اور ایمان کی بنا پر دو الگ الگ گروہوں میں تقسیم ہو جانے والے انسانوں کے باہمی تعلق کو قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کی داستان حیات میں (جسے اُس نے اسوۂ حسنہ بہترین نمونہ قرار دیا ہے) تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ انہوں نے (ایمان میں مشترک نہ ہونے والے) اپنے باپ اور پوری کی پوری قوم سے بر ملا کہہ دیا کہ

وَأَعْتَزِلْكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنَ دُونِ اللَّهِ..... (۱۹)

میں تم سے چھپیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان سب سے الگ ہوتا ہوں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ:-

إِنَّمَا بُرِّئُوا مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ

ہم تم سے اور ان سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو، ان سب سے بے تعلق ہیں۔

کُفِّرْنَا بِلَكُمْ..... ہم تم سے ہر رشتے کا انکار کرتے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔“ وَبَيَّنَّا بَيْنَكُمْ
وَالْبَعْضُ آدَاءُ الْبَعْضِ..... تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
کھلی کھلی عداوت اور نفرت رہے گی۔“ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو، اور یہ عداوت محبت

سے اور یہ نفرت، رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر ایمان لے آؤ جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے، حَتَّىٰ تَوْمِنُوا بِاللَّهِ وَخَلَدًا... (۶) اس لئے کہ اس عالمگیر اصول زندگی کی رُو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار، خون یا وطن کا رشتہ نہیں۔ معیار یہ ہے کہ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاَمَّتْهُ مَسَئِيْ (۷) جو شخص میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو) وہ میرے اپنوں میں سے ہے۔ اور میرے اپنے جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہوں وہ میرے غیر ہیں۔

غور کیجئے، حضرت ابراہیمؑ کی یہ قوم نسل، ثقافتی، لسانی، وطنی، ہر لحاظ سے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مشترک تھی۔ ان اشتراکات کے باوجود وہ کونسا عنصر تھا جس نے اُن میں ایسی گہری تفریق پیدا کر دی۔ ایمان (مذہب) اور صرف ایمان۔ چنانچہ انہوں نے اُن سے واضح طور پر کہہ دیا کہ تم اور ہم اُسی صورت میں ایک ہو سکتے ہیں جب تم ایمان میں ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ۔

حضور نبی اکرمؐ کے عہد رسالت میں کفر اور ایمان کی تفریق کی بنا پر جو دو گروہ وجود میں آئے وہ بھی نسل، ثقافتی، لسانی، وطنی، حتیٰ کہ رشتہ داری کی بنا پر مشترک تھے۔ اس تفریق کے بعد ان دونوں گروہوں کے متعلق واضح الفاظ میں فرما دیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بآءِ بَعْضٍ... (۸) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں۔ اور اُن کے مقابلہ میں، نہ ماننے والوں (کفار) کی قوم : بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بآءِ بَعْضٍ... (۹) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز۔ اس کے بعد اس قوم مومنین کو تاکید کر دی کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بٰطِلًا مِنْ دُوْنِكُمْ....

اے جماعت مومنین! تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔

اس لئے کہ لَا يَأْتِيَنَّكُمْ دَخَآلًا... یہ تمہاری تحریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وَدَّوْا مَا بَيْنَكُمْ... ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں اُلجھے رہو۔ قَدْ بَدَّتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَحْوَابِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ... ان کی بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آجاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمْ الْاٰیٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۰) ہم نے تمہیں واضح طور پر ان اور سے آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لو گے (تو زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے)۔

آپ نے غور فرمایا کہ اختلافِ مذہب (کفر و ایمان) کی بنا پر جو تفریق واضح ہوتی ہے اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں؟ ایمان کے اشتراک کی بنا پر یک جا ہونے والے افراد کو وہ صرف ایک گروہ کے افراد نہیں کہتا۔ وہ انہیں ایک دوسرے کے بھائی کہہ کر پکارتا ہے۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ اِخْوَانًا... (۱۱) اس نے تمہیں اپنی نوازش کریمانہ سے باہمی بھائی بھائی بنا دیا۔ یعنی جو لوگ نسل، ثقافتی، لسانی وطنی اعتبار سے ایک تھے وہ ایمان کے اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کے دشمن قرار پا گئے اور جو ان تمام

اعتبارات میں ایک دوسرے سے الگ تھے وہ محض ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ ابو جہل اور عمرؓ نسلی، ثقافتی، لسانی، وطنی، ہر لحاظ سے ایک تھے۔ لیکن جب عمرؓ ایمان لے آئے تو ان کے باہمی تمام رشتے منقطع ہو گئے۔ اور بلالؓ، عمرؓ کا بھائی بن گیا جو ان تمام اعتبارات کی رو سے عمرؓ سے مختلف تھا۔

آپؐ نے غور فرمایا کہ اسلام میں وحی جامعیت مذہب (ایمان) اور صرف مذہب ہے۔ نسلی، ثقافتی، لسانی، وطنی، خون، رنگ کا کوئی اشتراک نہیں۔ وَذَٰلِكَ السَّبِيلُ الْقَيِّمُ...

(۰)

(۲) قائد اعظمؒ اور بناؤ قومیت

قائد اعظمؒ نے اس حقیقت کو چند الفاظ میں اس جامعیت سے بیان کر دیا کہ جوں جوں انسان اُن پر غور کرتا ہے اس کی فکر وجد میں آجاتی ہے۔ انہوں نے ۸ مارچ ۱۹۴۷ء کو، علی گڑھ یونیورسٹی میں، ایک تقریر کے دوران کہا تھا:-

پاکستان کا آغاز اس دن سے ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب اُس غیر مسلم نے اسلام اختیار کیا تھا تو اُس نے اپنے نسلی، ثقافتی، لسانی، وطنی رشتوں کو نہیں بدلا تھا۔ وہ تو بدستور موجود تھے۔ اُس نے صرف مذہب کو بدل لیا تھا۔ اور اس تبدیلی (اور صرف اس تبدیلی) کی بنا پر وہ پاکستان کی پہلی اینٹ قرار پا گیا تھا۔ آپؐ نے غور فرمایا کہ قائد اعظمؒ نے مسلم قومیت کی بنا کس چیز کو قرار دیا تھا! صرف مذہب کو!

مسٹر گاندھی نے (خود فریبی یا ابلہ فریبی) کی بنا پر اعتراض کیا تھا کہ میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی دہنا چاہیے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعدد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

مسٹر گاندھی نے کہا تھا کہ جن لوگوں نے مذہب تبدیل کیا تھا ان کے نسلی، ثقافتی، وطنی ناتے تو بدستور غیر مسلموں کے ساتھ پیوست تھے۔ تبدیلی محض مذہب کی تھی، تو مذہب کو تشکیل قومیت سے کیا واسطہ کہ محض اس کی تبدیلی ان کی قومیت تبدیل ہو گئی؟ سنیے کہ قائد اعظمؒ نے اس سلسلہ میں مسٹر گاندھی سے کیا کہا تھا۔ انہوں نے اپنے خط میں لکھا تھا:-

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن آپ سے جب سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوتِ محرکہ

ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح؟ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ آج انسانی سچی دکادش کا دائرہ ایک ناقابل تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ نڈنی، سیاسی، معاشی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر رہے ہیں جس مذہب کو نوع انسان کے معاملات سے واسطہ نہ ہو میں اُسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ (جناح کا خط بنام گاندھی، جنوری ۱۹۴۷ء)

آپ نے غور فرمایا کہ قائد اعظمؒ نے مسٹر گاندھی کے اس اعتراض کا جواب ہی نہیں دیا۔ (کہ مذہب تشکیل قومیت کی بنا نہیں ہو سکتا) بلکہ یہ بھی واضح کر دیا کہ اسلام کی رُو سے تمام امور حیات کی بنا مذہب ہے۔ (غریب تفصیل کے لئے دیکھئے میرا مقالہ۔ کیا قائد اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟۔ (مطبوعہ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۸۰ء و نوائے وقت مورخ، اکتوبر ۱۹۸۰ء)۔ اس سے یہ فطری نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کا مذہب دوسروں سے مختلف ہوگا تو ان کی ثقافت، تمدن، معاشرت، سیاست سب دوسروں سے مختلف اور منفرد ہوں گے کیونکہ ان کے مذہب کی اصل کی شاخیں ہوں گی۔ اسی بنا پر قائد اعظمؒ نے کہا تھا کہ مسلمانوں کا تمدن و ثقافت وغیرہ بھی دوسروں سے مختلف ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں تھی کہ ان کی قومیت کی بنیاد، مذہب کو چھوڑ کر ان کا تمدن یا ثقافت تھی۔ انہوں نے اس خط میں یہاں تک کہ دیا تھا کہ اگر مذہب نہ رہے تو وہ زندگی انسانی نہیں، محض غوغا آرائی اور ہنگامہ خیزی رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(۳) دوسری قوموں کا غم!

پروفیسر صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ اگر اسلام کے اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ قومیت کی بنیاد اشتراک ایمان ہے تو دنیا کی ان قوموں کا کیا بنے گا جو ایک مذہب (عیسائیت) رکھنے کے باوجود دیگر عناصر راسل وطن وغیرہ کی بنا پر اپنا مختلف قومی تشخص رکھتی ہیں۔ یقین مانیے! ایک پڑھے لکھے شخص کی طرف سے اس قدر عامیانہ اعتراض دیکھ کر ہمیں بڑا افسوس ہوا۔

اسلام ہر شعبہ حیات کے متعلق اپنے مخصوص اور منفرد اصول رکھتا ہے۔ اگر ہم ان اصولوں کو اپنا نظام حیات قرار دیتے ہیں تو ان کا اطلاق ان اصولوں کو ماننے والے (مسلمانوں) پر ہوگا۔ غیر قوں کو اختیار ہوگا کہ وہ جی چاہے تو ان اصولوں کو اپنے ہاں رائج کر لیں، اور جی چاہے تو اپنے مرتجعہ اصولوں پر کاربند رہیں۔ اگر وہ نسلی یا وطنی اشتراک کو بنا قومیت قرار دیتے ہیں تو دیتے رہیں۔ ہمیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم اپنے ہاں اسے بنا قومیت قرار نہیں دیں گے۔ ہماری قومیت کی تشکیل اشتراک مذہب کی بنا پر ہی ہوگی۔

(ضمناً) پروفیسر صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اب تو اقوام مغرب کے دانشور بھی اپنے ہاں کی بنا قومیت کے ہاتھوں تنگ آچکے ہیں اور کسی متبادل بنا قومیت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ہم

انہیں مشورہ دیں گے کہ وہ نبی خاتم کے موضوع پر دانشورانہ مغرب کے حالیہ خیالات کا مطالعہ فرمائیں۔ وہ تو اپنے ہاں کی قومیتوں سے اس قدر تنگ آ چکے ہیں اور ہمارے مقالہ نگار اس علم میں نڈھال ہو رہے ہیں کہ اگر ہم نے مذہب کو بناء قومیت تسلیم کر لیا تو اقوام مغرب کا کیا بنے گا؟ اب آئیے مسلمان قوموں کی طرف۔ سوال یہ ہے کہ اسلام کی رو سے ایمان کا اشتراک بناء قومیت ہے یا نہیں۔ اگر یہ بناء قومیت ہے تو کسی اور عنصر (وطن، نسل، زبان، رنگ) کو بناء قومیت قرار دینا خلاف اسلام ہے۔ اگر مسلمان نام رکھنے والی قومیں ایسا کرتی ہیں تو ان کا یہ عمل اسلام کے خلاف ہو گا۔ لیکن پروفیسر صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ اگر یہ اصول (کہ مذہب بناء قومیت ہے) صحیح بھی ہے تو بھی ہمیں اسے اس لئے اختیار نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے موجودہ مسلمان قوموں کا تشخص باقی نہیں رہے گا۔ گویا ہمیں ایک اسلامی اصول کو اس لئے اختیار نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے غیر اسلامی اصولوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ کیسی دلچسپ ہے یہ منطق!

اسلام کا منتہی، وحدت انسانیت ہے۔ اس کے لئے وہ بطور قدم اول ایسی قوم تیار کرتا ہے جو نسل، رنگ، زبان، وطن کی حدود سے بند ہو کر خالص ایمان کے اشتراک سے وجود میں آئے۔ اس نے ایسی ہی امت تیار کی تھی۔ صدر اول کے مسلمانوں میں صرف امت مسلمہ کا وجود تھا۔ مصری، شامی، عراقی، حجازی، مسلمان قوموں کا وجود نہیں تھا۔ ان قومیتوں کا وجود اُس زمانے میں عمل میں آیا جب ہماری گاڑی اسلام کی پیٹری سے الگ ہو گئی۔ جب اسلام دوبارہ نافذ العمل ہو گا تو یہ جاہلیہ کے تشخصات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ علامہ اقبال (جنہوں نے اس بناء قومیت کا تصور دیا تھا) کے پیش نظر یہی تھا۔ انہوں نے ۱۹۲۳ء میں کہا تھا:۔

یتان رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی (بانگ درا)

اور یہ

یہ ہندو، وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں ہال و پر تیرے
تو اسے شرمندہ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا ()
تو اسے مرغِ حرم اٹنے سے پہلے پُرفشاں ہو جا ()

نیز یہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
جو کر بگا امتیاز رنگ و نگوں مٹ جائیگا
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کا شجر ()
ترکِ خراگاہی ہو یا اعرابی والا گہرا ()
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر ()
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی

اور زندگی کے آخری دور میں یہ

رہے گا راویِ ذیل و فرات میں کب تک
تیرا سفینہ کہ ہے بحر بیکراں کے لئے (بالِ جبریل)
وحدتِ امت کے اسی قرآنی تصور کو پیکر عطا کرنے کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور دیا تھا، جس میں ہمارا
ہماری نئی نسل کی ذہنیوں کے معمار (اساتذہ) انہیں یہ سبق پڑھا رہے ہیں کہ اگر اس نظریے کو اپنایا گیا تو

اقتضائی، توراتی، خراسانی کا کیا بنے گا؟ اس لئے خیر اسی میں ہے کہ اس قوم پر غیر اسلامی نظریات مسلط رہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر کلاس میں کبھی علامہ اقبالؒ کے مندرجہ بالا اشعار سامنے ہوں گے تو فتح نصیب صاحب اپنے شاگردوں سے کہتے ہوں گے کہ اقبالؒ مسلمانوں کو غلط سبق پڑھا گئے ہیں؟

(۶)

(۴) ثقافتی ورثہ

تحریک پاکستان کے دوران مخالفین کی طرف سے اشتراک وطن ہی کو وجہ ہجاعت قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن پاکستان میں اگر جغرافیائی اشتراک کے علاوہ، ایک اور تصور "ثقافتی ورثہ" کا بھی وجود پذیر ہو گیا۔ اگرچہ ثقافت کے متعلق آج تک کسی نے نہیں بتایا کہ اس کا متعین مفہوم کیا ہے؟ یہ ایک بڑی گہری سائنس کا نتیجہ ہے۔ اس کے پیچھے دو جذبات کا رفا ہیں۔ مسٹر گاندھی نے یہ کہا تھا کہ اگر کچھ ہندو تبدیل مذہب سے مسلمان ہو جاتے ہیں تو وہ صرف اپنا مذہب بدلتے ہیں۔ وہ ثقافت (کلچر) ہڈاں میں ورثہ چلا آ رہا ہے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اس ورثہ کی بنیاد وہ اپنی سابقہ قومیت کے افراد قرار پاتے ہیں۔ یہ سائنس ابھی تک ریگتی، سنگتی، پاکستان کی طرف آ رہی ہے۔ غیر ملکی سیاح پہلے ہندوستان جاتے ہیں اور وہاں سے پاکستان آتے ہیں۔ وہ دونوں ملکوں میں موسیقی، رقص، ڈرامے، وغیرہ دیکھنے کے بعد یہ تاثر دے جاتے ہیں کہ اس ثقافتی ورثہ میں ہم نے ان دونوں ملکوں میں کوئی فرق نہیں دیکھا۔ اس لئے یہاں کا مسلمان اور وہاں کا ہندو اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے۔ ان میں بھر صرف سیاسی مفادات کا پیدا کردہ ہے۔

کچھ قوموں کو خطرہ لاحق ہوا کہ پاکستان اگر اسلام کے نام پر نہ سہی وطن کی بنا پر بھی ایک ملک اور ایک قوم کی حیثیت سے قائم رہ گیا تو ان کے لئے وجہ درد سر رہے گا۔ اس کے ازالہ کے لئے کچھ عرصہ ہوا روس سے ایک مؤرخ تشریف لائے جنہوں نے (NATIONALITIES IN PAKISTAN) کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس میں انہوں نے اس نظریہ کو اجاگر کیا تھا کہ قومیت کی بناء ثقافت ہوتی ہے۔ اور پاکستان کے مختلف صوبوں کی ثقافت الگ الگ ہے۔ اس لئے یہاں ایک (پاکستانی) قوم نہیں رہتی۔ چار (صوبوں کی) مختلف قومیں آباد ہیں۔ اس نظریہ کو فیض اور جوش جیسے فلمکاروں نے ہی نہیں مسٹر تبرنجو اور مینگل جیسے سیاستدانوں نے بھی خوب اچھا لایا تھا۔ اب چودھری فتح نصیب صاحب بھی فرما رہے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں ثقافتی ورثہ کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

خداوند! یہ تیرے سادہ دل بندے کہہ رہا ہیں؟ (بال قبریل)

(۵) قوم نہیں امت!

مقالہ نگار کا اگلا اعتراض یہ ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو امت قرار دیا ہے، قوم نہیں۔ اس لئے وہ

مذہب کے اشتراک سے ایک اُمت تو بن سکتے ہیں۔ قوم نہیں بن سکتے۔

اس سے ہمیں وہ معرکہ یاد آگیا جو تحریک پاکستان کے دوران (مولانا) حسین احمد (مدنی) اور علامہ اقبالؒ میں برپا ہوا تھا۔ مولانا مرحوم نے اپنی تقریر میں کہا کہ ”قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں“ اس پر علامہ مرحوم ٹرپ اٹھتے اور انہوں نے اپنے بستر مرگ پر لیٹے لیٹے یہ اشعار فضا میں پھیلا دیئے کہ:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں و رُسرا! زبوں بند حسین احمد! چہ بولوا لعلی است (اردنانہ جاز)
سرودِ سیرِ منیر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است! (۸)
مولانا مرحوم نے اس کے جواب میں ایک لمبا چوڑا بیان شائع فرمایا جس میں سارا زور اس نکتہ پر صرف کیا گیا تھا کہ میں نے اپنی تقریر میں ”قوم“ کہا تھا ”ملت“ نہیں کہا تھا۔ اقبالؒ نے میرے بیان میں تحریف کی ہے اور پھر ملت اور قوم کے لغوی معانی پر وہ بحث شروع کر دی تھی جس کا نفس موضوع سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ نے اپنے جواب میں کہا تھا کہ:

قلندرجذو و حرفِ لالہ کو کچھ بھی نہیں رکھتا فقیہ شہرِ قاروں ہے لغتِ ہائے حجازی کا (بالِ جبریل)
اسی کی صدائے بازگشت فتح نصیب صاحب کے منالہ میں سنائی دیتی ہے۔ جہاں وہ کہتے ہیں کہ قرآن نے مسلمانوں کے لئے اُمت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ قوم کا نہیں۔ اور ”امت“ اور ”قوم“ کے لغوی معانی میں بڑا فرق ہے۔

یہ صاحب سیاسیات کے استاد ہیں اس لئے ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا چھوڑا منہ بڑی بات کے مترادف کہ جب کوئی لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہونے لگے تو اس کے لغوی معنی نہیں لئے جاتے۔ اصطلاحی مفہوم لیا جاتا ہے اور ان میں اکثر بڑا فرق ہوتا ہے۔

دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ لفظ قوم یا نیشن نے جو سیاسی مفہوم آج کل اختیار کر رکھا ہے زمانہ نزولِ قرآن کے عرب معاشرہ میں اس کا تصور تک نہیں تھا۔ وہ لوگ اس لفظ (قوم) کو ان معنوں میں استعمال کرتے تھے جن معنوں میں ہم لفظ ”لوگ“ استعمال کرتے ہیں۔ (وہ تو بکر اس میں غورتوں کو بھی شامل نہیں کیا کرتے تھے) قرآن کریم نے (مثلاً) جب قَوْمُ الْمُجْرِمِینَ (۱۳۴) کہا تو اس کے معنی وہ لوگ تھے جو جرائم کے مرتکب ہوتے تھے۔ اُس نے جب یَقَوْمٌ یُحْقِلُونَ (۲۵) کہا تو اس سے مراد وہ لوگ تھے جو عقل و فکر سے کام لیں۔ اس نے جب مختلف انبیاء کی اقوام کا ذکر کیا تو اس سے مراد وہ لوگ تھے جن کی طرف وہ انبیاء مبعوث ہوئے تھے یا جن میں وہ رہتے سمیت تھے۔ ان آیات میں لفظ قوم سے مراد آج کل کی سیاسی اصطلاح کی نیشن نہیں تھی۔

علامہ اقبالؒ کو ایک دفعہ اور بھی اسی قسم کے الجھاؤ سے واسطہ پڑا تھا۔ وطن پرست (نیشنلسٹ) طبقہ نے کہیں سے عربی کا ایک فقرہ — حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْإِبْتِمَانِ — سن لیا اور اُسے حدیثِ نبویؐ کہہ کر یہ دعویٰ کر دیا کہ حب الوطنی (PATRIOTISM) ایمان کا جزو ہے۔ علامہ اقبالؒ نے یہ سنا تو کہا کہ اول تو یہ فقرہ حدیثِ نبویؐ ہے ہی نہیں اور اگر اس کی کچھ حقیقت ہے بھی تو

اس میں وطن سے مراد محض جائے سکونت ہے۔ وہ سیاسی مفہوم نہیں جو اس سے آجکل لیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے انہوں نے اپنی مشہور نظم (وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے) میں کہا تھا کہ

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے (باگمبرا)
 گفتار سیاست میں "وطن" وہ ہے کہ جو یہ ہیں اس کا ہے وہ نسب کا گھنٹہ ہے
 سوال یہ ہے کہ آج کل کی اصطلاح میں قومیت کی جو بنیاد ہے کیا وہ اسلام کے مطابق ہے۔ اور اس کا جواب دو ٹوک الفاظ میں "نہی" میں ہے۔ قرآن کی رو سے قومیت کی بنیاد ایمان کا اشتراک ہے اور بس۔

اب دلائل معترض کا یہ دعویٰ کہ قرآن کریم نے جماعت مومنین کو "امت" کہا ہے۔ "قوم" نہیں کہا تو یہ ان کی قرآن سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ قرآن میں جماعت مومنین کے لئے قوم کا لفظ بھی آیا ہے (مثلاً) سورہ الاسراء میں ہے هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۰۵﴾ "ہدایت و رحمت اس قوم کے لئے جو ایمان لائی ہے۔" اس کے برعکس اس نے کفار کے لئے (غنم) قَوْمٍ لَّهِ يَوْمَئِذٍ هَدًى (۱۰۶) کہا ہے وہ قوم جو ایمان نہیں لائی۔ سورہ مائدہ میں ان دونوں گروہوں کا تقابل بڑے بلیغ انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ فرمایا:-

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ فَاَوْفَىٰ يَدَهُمْ وُجُوهَهُمْ وَاللَّهُ عَنِ اللَّهِ عَنْهُمْ وَرَمَزُوا أَمْسَهُمْ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۰۷﴾

تو کبھی ایسا نہیں دیکھے گا کہ وہ قوم جو خدا اور آخرت پر ایمان رکھے۔ وہ ان لوگوں سے دوستی کے تعلقات استوار کرے جو نظام خداوندی کے مخالف ہوں خواہ وہ ان کے ماں باپ بیٹے (بیٹیاں) بھائی بھائی ان کے خاندان کے دیگر افراد ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ افراد مومنین وہ لوگ ہیں کہ ایمان جن کے دل کی گہرائیوں میں راسخ ہو چکا ہے اور خدا کی وحی کی قوت ان کی تائید و نصرت کا سامان بہم پہنچا رہی ہے۔ یہ اس جتنی معاشرہ میں داخل ہوں گے جن کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آئے گا۔ اللہ ان سے راضی ہو گا کہ اللہ سے راضی ہوئے۔

یہ ہے خدا کی پارٹی۔ یاد رکھو! آخر الامر کامیابی اور کامرانی خدا کی پارٹی ہی کو نصیب ہوگی۔

یہاں دیکھئے مومنین کو قوم کہا گیا ہے۔ انہوں نے ان لوگوں سے تعلقات منقطع کر لئے جو اگرچہ نسلی، لسانی، ثقافتی، خاندانی اعتبار سے ان میں شامل تھے لیکن چونکہ وہ ایمان میں ان سے الگ تھے اس لئے ان میں بھی ایسے تعلقات نہیں تھے جو (آجکل کی اصطلاح میں) کسی قوم کے افراد میں ہوتے ہیں۔ اور سب سے

آخر یہ کہ انہیں حزب اللہ (رضا کی پارٹی) کہا گیا۔ ان کے برعکس ایمان نہ لانے والوں کو حزب الشیطان (۵۴) انہی کو موجودہ اصطلاح میں مسلمانوں کی قوم اور غیر مسلموں کی قوم کہا جائے گا۔

اگر اُمت اور قوم کے لفظی اختلاف سے یہ نتیجہ اخذ کیا جانا مقصود ہے کہ اُمت کا لفظ مذہبی امور سے ہے اور قوم کا سیاسی امور سے، تو یہ دین اور سیاست کی وہ ثنویت ہے جو اسلام کی جڑ بنیاد کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ قرآن کی روش سے مملکت، ایمان اور اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ وَقَدْ أَتَى الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ... لِيَسْئَلَنَهُمْ لَهْمُ ذَلِكَ أَيُّهَا... اور اس اختلاف (مملکت و حکومت) کا مقصد دین کا تسکین... لیسئلہم لہم ذلك ایہ... (۲۳) اور اس فریضہ کی ادائیگی، اُمت کے سپرد کی گئی ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ... (۲۴)

ہم پوچھتے ہیں مقالہ نگار سے کہ موجودہ سیاست کی روش سے... قوم کا وجود اور کاہے کے لئے جوتا ہے؟ سو اگر قوم کا فریضہ وہی ہوتا ہے جسے قرآن نے اُمت کا فریضہ قرار دیا ہے تو پھر اس سے فرق کیا پڑتا ہے کہ قرآن نے جماعتِ مومنین کے لئے اُمت کا لفظ استعمال کیا ہے، قوم کا نہیں (اگرچہ اس نے قوم کا لفظ بھی استعمال کیا ہے)

قرآن نے اُمت کے لفظ کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ لغت کی روش سے بھی اس میں دین اور جماعت دونوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ یعنی دین کی بنیادوں پر متشکل اور دین کے مقاصد کو پورا کرنے والی جماعت کو اُمت کہا جاتا ہے۔ لہذا خود اس لفظ سے بھی ان تمام اعتراضات کا جواب مل جاتا ہے جو مقالہ نگار نے اپنی سطح بینی کی بنا پر اٹھائے ہیں۔

اس سے زیادہ ہم پروفیسر صاحب اور ان کے ہم لڑاؤں سے کیا کہیں گے کہ یہ
بیاں میں نکتہ توجہ آتو سکتا ہے تیرے داغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے! (حزبِ کلیم)
مغربی نظامِ تعلیم ہمارے قوم کے ذہنوں میں کتنے بت خانے تعمیر کر رکھے ہیں؟

خریدار صاحبان متوجہ ہوں!

- ۱۔ بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنرز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلا وجہ تاخیر نہ ہو۔
- ۲۔ ہرچند ملنے کی اطلاع خریدار ماہ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ اس صورت میں ہر پیرچہ دوبارہ ارسال کیا جائے گا۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

۳۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ارسال کریں۔